Date of Publication: 02-03-2013 — **PRICE Rs. 2/-**

POSTED ON 03-04 March 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 March 2013 — ۸تا۱۴ مارچ ۲۰۱۳ء

Issue: 10, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۱۰، جلد نمبر: ۷۲

جب اردو بُتِ خانۂ آذر کا حسین مجسمہ تھی

کچھ ادب اور فلم کے تعلق سے

شوکت تھانوی کا شمار اردو کے چوٹی کے مزاح نویسوں میں کیا جاتا تھا اور اُن کا نام کنہیا لال کپور، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں حوادث اور محسوسات کی تصویر کشی مزاحیہ انداز میں کرتے تھے۔ نثر کے لطیف نکتے، ظرافت اور مزاح کے عمدہ نمونے اُن کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اُن کے ڈرامے نشر ہوتے تھے۔ اُن کے 13 ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'سنی سنائی' بڑا مقبول ہوا تھا جس میں اُن کا طرزِ انشا، البیلا مزاح لطیف اور طنز بے پناہ مروج تھا۔ 'لاہوریات' میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے لاہور کے قیام کے دوران میں پیش آنے والے واقعات کی تصویر کشی کی تھی۔ 'بیوی' اُن کا مشہور ناول تھا۔

نصف صدی سے بھی کچھ زائد عرصہ گزرا فلم ساز شوکت حسین رضوی نے شوکت تھانوی کی ایک کہانی کو لے کر فلم 'گلناز' بنانے کا اعلان کیا جس کی ہیروئن نور جہاں تھیں۔ سید امتیاز علی تاج اس کے ہدایت کار تھے۔ 'گلناز' کا اسکرپٹ قدیم لکھنؤ کے پس منظر میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کی کہانی مثنوی 'زہرِ عشق' سے اخذ کی گئی تھی۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ اس میں شوکت تھانوی بھی ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے اور بطور اداکار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اس سے پہلے وہ ریڈیائی ڈراموں میں بھی پارٹ لیا کرتے تھے۔ شوٹنگ کے دوران سیٹ پر ماحول پُرلطف رہتا تھا کیوں کہ شوکت تھانوی مزاحیہ گفتگو میں یکتا تھے۔ ناطق فلموں کے ابتدائی دور کی ہیروئن اور گلوکارہ ببّو اس فلم میں ایک معمر خاتون کے روپ میں پیش ہوئی تھی جو ادبی ذوق رکھنے کے باعث حاضر جواب تھی۔ اس میں مذاق کرنے اور مذاق سہنے کی صلاحیت تھی۔ دورانِ فرصت شوکت اور ببّو کی نوک جھونک سماں باندھ دیتی تھی۔ پھبتیوں کا دور چلتا اور کبھی کبھی مذاق ابتذال کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ امتیاز علی تاج سنجیدہ قسم کے انسان تھے، خاموش رہتے یا منہ پر رومال رکھ کر مسکراتے رہتے۔ بعض اوقات ایسی نوبت بھی آتی کہ انھیں اِدھر اُدھر ہو جانا پڑتا۔

وشوناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا [یوپی] 201303)

شوکت تھانوی فقرے بازی کے فن کے امام تھے۔ دورانِ گفتگو وہ ایسے فقرے کستے کہ سب کو لاجواب کر دیتے مگر ببّو نے بھی اُن سے ہار نہیں مانی تھی۔ وہ جب فقرے بازی پر اترتی تو شوکت کے پسینے چھوٹ جاتے تھے اور وہ اکثر یہ کہتے سنائی دیتے کہ ببّو میں نے بھری محفل میں بھی کسی سے ہار نہیں مانی مگر میں تم سے ہار جاتا ہوں۔ واقعی تم لاجواب ہو۔ اپنے دور کے ایک عظیم ادیب کی زبانی ستائش کے یہ جملے سن کر ببّو خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ عمر ڈھلنے کے باعث میرے مداح ختم ہو گئے لیکن شوکت حوصلہ افزائی کرکے مجھے تازہ دم رکھتے ہیں اور میں اکثر محسوس کرتی ہوں کہ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔

ہنسنے کھیلنے ماحول میں بننے والی فلم 'گلناز' پر سب نے بڑی جان ماری کی۔ میوزک ماسٹر غلام حیدر کا تھا جنھوں نے بڑی مدھر دھنیں تیار کی تھیں اور موسیقی کا جادو بکھیرا تھا۔ 'خاندان' اور 'شہید' کے بعد وہ ایک بار پھر معراج پر پہنچے تھے۔ نغمے فلم کی نمائش سے قبل ہی زبان زد عام ہو گئے۔ خاص طور سے یہ نغمہ بہت پسند کیا گیا:

'چاندنی راتیں تاروں سے کریں باتیں'

باقی سبھی گانے بھی ہٹ ہوئے اور غلام حیدر کا نام ایک بار پھر انڈسٹری میں گونجنے لگا۔ 'نور جہاں' پہلے ہی ٹاپ پر تھی اب وہ اور اونچی اڑانیں بھرنے لگی۔ فلم سے سب کو بڑی توقعات تھیں مگر جب مارکیٹ میں اتاری گئی تو سوائے ہٹ میوزک کے کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ کئی خوبیوں کے باوجود سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ فلم میں حقیقی ماحول اور پس منظر مفقود تھا جس نے تماش بینوں کو مایوس کیا اور تبصرہ نگاروں نے بھی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ شوکت تھانوی کی ایکٹنگ سب کو اچھی لگی اور انھوں نے اداکاری کو اپنا مستقل پیشہ بنا لیا۔ کئی فلموں میں کام کیا۔

عشرت سلطانہ عرف ببّو کسی زمانے میں ساگر فلم کمپنی کی مشہور ہیروئن ہوا کرتی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں دلی میں پیدا ہوئی تھی۔ طبیعت بچپن سے اداکاری، رقص و موسیقی کی جانب مائل تھی اس لیے فلم لائن میں چلی گئی۔ اچھی اداکارہ ہونے کے ساتھ اچھی سنگر بھی ثابت ہوئی۔ ہیروئن اور ویمپ کا کردار یکساں خوبی کے ساتھ نبھایا کرتی تھی۔ اُن دنوں بھی بہت جس کم تھی، جس محفل میں جاتی اُسے

مضمون نگاروں سے درخواست

'ہماری زبان' کے مضمون نگاروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضمون صاف اور خوش خط تحریر کرکے ارسال فرمائیں۔

بعض حضرات مضمون کی زیروکس کاپی یا اپنے مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمارے لیے ایسے مضامین شائع کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایسے مضامین ضائع کر دیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

زعفران زار بنادیا کرتی تھی۔ پہلی بار فلم 'دوپٹہ' میں ایک چھوٹا سا رول ملا تھا جو اس نے خوش اسلوبی سے نبھادیا۔ پھر بڑے کردار ملنے لگے اور فلمیں کامیاب ہوتی چلی گئیں۔ جسم تھوڑا بھاری تھا لیکن اس کی سُریلی آواز نے لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ 'جاگیردار' اور 'مگر اسٹون سنگز' فلموں کے باعث بڑی مشہور ہوگئی۔ اس کا یہ گانا بچے بچے کی زبان پر تھا "پیاری میرے مندر میں آؤ" ایک اور نغمہ:

تمھیں نے مجھ کو پریم سکھایا
سوئے ہوئے ہردے کو جگایا

بہت پاپولر ہوا تھا۔ ایک بار اس کی ایک فلم دیکھ کر بمبئی کے گورنر نے اس کی تعریف کی تھی جس کی وجہ سے وہ مغرور ہوگئی اور اس کے نخرے بڑھنے لگے۔

اپنے دو شوہروں کو چھوڑ کر پچھلے گھر کے تعلقات پر یقین کرنے لگی۔ ماہ قرصن ڈھلنے کے دن آگئے اور موٹاپا جسم پر چھا گیا تو سب نے آنکھیں پھیر لیں، کام ملنا بند ہوگیا۔ ملک کا بٹوارہ ہوگیا تو قسمت آزمائی کے لیے لاہور چلی گئی اور وہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چند فلموں میں کام کرنے کے بعد وہاں بھی مارکیٹ ختم ہوگئی۔ کام حاصل کرنے کی کوشش میں وہ اسٹوڈیوز کے چکر کاٹتی رہتی تھی۔ فلم 'مغل اعظم' میں سنگ تراش کا کردار عمدگی سے نبھانے کے باوجود جب اداکار کمار کو بھی اداکاری کے میدان میں دشواری محسوس ہونے لگی تو وہ بھی پاکستان چلا گیا۔ ایک دن اس کا کسی اسٹوڈیو میں اپنی پرانی ہیروئن [illegible] سے سامنا ہوا تو دونوں گلے ملے۔ کمار بار بار "میری [illegible]، میری [illegible]" کہہ کر پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتا رہا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بمبئی میں جب کیسے اچھے دن تھے اور اب کتنا مایوس کردینے والا ماحول تھا۔ تو کے پاس جب فلم انڈسٹری سے آ گئے اور کوشش بسیار کے باوجود کام نہ ملا تو اس نے شراب کی ناجائز درآمد اور برآمد کا دھندا شروع کردیا، پکڑی گئی تو نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ آخر کار گمنام موت نصیب ہوئی۔ اب اُسے یاد کرنے والا کوئی نہیں۔

مشہور اداکارہ مینا کماری نے اپنے ایک مضمون میں اردو کے فلمی اخبار نویسوں کے بارے میں اپنے خیالات اور تجربات بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیے تھے۔ ویکلی 'فلم آرٹ' دلی اور ماہنامہ 'شمع' کے بمبئی میں مقیم خصوصی نمائندے مسٹر رازدان ایم اے کے بارے میں اس نے لکھا کہ وہ ایک گھریلو قسم کے شریف انسان ہیں جو دوران گفتگو اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ بیگانگی کا احساس تک نہیں رہتا، عام فلم جرنلسٹ جن کمزوریوں کا شکار ہیں وہ ان سے بہت دور ہیں۔ رازدان صاحب نے مینا کماری سے ہفت روزہ 'فلم آرٹ' کے لیے ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو مینا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس عنوان سے، کس نوعیت کا مضمون تحریر کرے۔ بہرحال اس نے ایک مضمون ''اور چنا پیدا ہوگیا'' سپرد قلم کیا اور رازدان کے حوالے کردیا۔ مضمون شائع ہوا تو قارئین نے اُسے بہت پسند کیا اور بڑی تعداد میں تعریفی خطوط مینا کماری کے پاس پہنچے جن سے حوصلہ پاکر اس نے بعد میں اردو میں کئی مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں اشاعت کی غرض سے بھیجے۔

بمبئی کے روزنامہ 'انقلاب' کے تحت چھپنے والے ممتاز ہفت وار فلمی رسالے 'کہکشاں' کے مدیر مسٹر ذکی پریم نگری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ وہ سوالات معقول کے مطابق اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں لیکن ایک بار انھوں نے غیر ارادی طور پر کچھ ایسی باتیں چھاپ دیں جن سے ڈائرکٹروں میں موصوفہ کی پوزیشن خراب ہوگئی مگر بعد میں اداکارہ نے اپنی صفائی میں جو بیان جاری کیا 'اس' سے فضا بالکل صاف ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد ذکی پریم نگری پاکستان ہجرت کرگئے تھے اور وہاں انھوں نے کراچی کے مشہور ہفتہ وار فلمی اخبار 'نگار' کی ادارت کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے اور اُسے ملک کا سب سے مقبول فلمی پرچہ بنادیا۔ ویکلی 'کہکشاں' سے وابستہ ایک اور فلمی صحافی حسن صحرائی کے بارے میں مینا نے بتایا کہ وہ ایسے انداز سے سوال کرتے ہیں جیسے راشننگ انسپکٹر راشن کارڈ بناتے وقت عام طور پر پوچھا کرتے ہیں ''آپ کا نام؟ آپ کے باپ کا نام؟ آپ کا ایڈریس؟'' وغیرہ وغیرہ۔ اس کے باوجود مینا کماری کو حسن صحرائی صاحب سے اور کوئی جھجک نہیں ہوتی تھی اور وہ ان کا بڑا احترام کرتی تھی۔

ساٹھ برس قبل راقم دلی کے مشہور علمی و ادبی رسالے 'رہنمائے تعلیم' کا فلم ایڈیٹر تھا۔ ۱۹۵۳ء میں اس کا خصوصی فلم ایڈیشن شائع کرنے کا اعلان ہوا تو میں نے مینا کماری سے مضمون بھیجنے کی فرمائش کی۔ اس نے 'شیطان بچارہ' کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھ کر بھیجا جو شامل اشاعت کیا گیا۔ اس میں ابلیس اور جبرئیل کے مابین مذاکرات کے علاوہ کچھ شعر بھی درج تھے۔ اُن دنوں مینا کماری کمال امروہوی کی شریک حیات تھی اور ان دونوں کے تعلقات خوشگوار تھے۔ مینا بنگلور سے شائع ہونے والے ماہانہ اردو فلمی جریدے 'عبرت' کی سرپرست تھی جسے جناب کامدار اگرتی ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ دونوں نے مجھے اپنے پرچے کا خصوصی نمائندہ مقرر کیا تھا اور میں نے مسوری میں منعقد ہونے والے انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں 'عبرت' کی نمائندگی کی تھی۔ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ عید کے موقعے پر گرہستی، دیور، گماشتہ، آنند بھون وغیرہ مشہور گھریلو فلموں کے ڈائرکٹر ایس ایم یوسف نے اپنے دوستوں کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے دوران نامور ادیب اور شاعر شمس لکھنوی نے ایک پیچ طلب کیا تو حسرت لکھنوی نے شمس صاحب کے اسسٹنٹ اسلم نوری کو آواز دے کر کہا ''اسلم تمھیں شمس صاحب یاد فرما رہے ہیں''۔ اسلم شمس صاحب کے پاس گیا اور پوچھا ''آپ نے مجھے کس کام کے لیے بلایا ہے؟'' شمس نے کہا ''نہیں، میں نے تو پیچ مانگا ہے'' حسرت بولے ''تو یہ کیا ہے؟'' یہ سن کر سبھی مہمان خوب ہنسے اور اسلم نوری بے چارہ جھینپ کر رہ گیا۔ خیال رہے اسلم نوری ہر وقت شمس لکھنوی کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا اور اختلاف رائے کی جسارت اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

حسرت لکھنوی نے ۱۹۵۲ء میں فلم 'آبشار' بنائی تھی جس کا افسانہ ان کا اپنا تھا، مکالمے واحد قریشی نے لکھے تھے اور نغمے قتیل شفائی اور سرشار سیلانی کے قلم سے تھے۔ گیتا بالی، ماجگادر، کلدیپ کور اور تیواڑی نے اس فلم میں کام کیا تھا۔ فلم ناکام ثابت ہوئی۔ حسرت نے اس سے پہلے کئی فلموں کے گیت اور مکالمے لکھے تھے اور ان کی کچھ کہانیاں بھی فلمائی گئی تھیں۔ 'آبشار' کی ناکامی سے دل برداشتہ ہوکر وہ پاکستان پہنچے اور وہاں فلم سازی کا دھندا شروع کیا۔ کامیابی ملی یا نہیں اس کا پتہ نہ چل سکا۔

۱۹۵۳ء میں مجروح سلطانپوری نے ایک فلم 'ارمان' میں چند اشعار کا پلے بیک ترنم دیا تھا جسے بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ اشعار فلم میں ہیرو دیو آنند کے منہ سے کہلوائے گئے تھے۔ اپنے اس عمل کے بارے میں انھوں نے ایک اخبار کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر فلمساز اپنی فلموں میں مجھ سے مترنم غزلیں پڑھوانا چاہتے ہیں تو میں اسے بہ Profession اپنانے کے لیے تیار ہوں۔ ایک دوسرے اخبار نے اُن کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر وہ اس ضمن میں سنجیدہ ہیں تو انھیں اخبارات میں واضح طور پر اس کا اعلان کردینا چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فلمساز براہ راست اُن سے بات کرکے معاملہ طے کرلیں۔ اس پر مجروح صاحب نے دوستوں کو بتایا کہ انھوں نے ازراہِ مذاق یہ بیان دیا تھا اور کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

فلم 'ارمان' ایک عام انسان کے ارمانوں کی کہانی تھی جو ظلم سہتا ہے اور سچ کا انکار کرتا ہے۔ مدھوبالا، دیو آنند،

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دوسری قسط

کیا نقّاد ادب کا غیر اہم آدمی ہے؟

وارث علوی (سیّد واڑہ، اُستوڈیا، احمدآباد 380002)

تنقید کے برعکس شعر و ادب کی دنیا میں معمولی تخلیق بھی اعلا تنقید کے سامنے پُرشوکت ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے شعبے کو بھی آرٹ کا معجزہ سمجھتی ہے۔ ادب کی سرزمین میں ہر بونا باون گزا ہونے کے فریب میں مبتلا ہے اور مشاعروں اور فلموں کی مقبولیت اس کی خود فریبی میں اضافہ کرتی ہے۔ تنقید اسے یہ فریب کھانے سے انکار کرتی ہے تو وہ جھلاتا ہے اور کہتا ہے کہ بہر صورت تخلیق تنقید سے افضل ہے۔ بے شک ہے، لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ایک معمولی نظم، ناول یا افسانہ ایک غیر معمولی تنقیدی تحریر پر فضیلت رکھتا ہو۔ ان ہزاروں شاعروں کے دیوان کہاں ہیں جن کے نام ہم تذکروں میں پڑھتے ہیں۔ اور ایک 'مقدمہ شعر و شاعری' ہے جس نے ہزاروں ذہنوں کو جلا بخشی۔

تنقید ہو یا تخلیق اس میں دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ کون سے ذہن کی کارفرمائی ہے۔ تخلیق غیر معمولی تخلیقی قوت کی متقاضی ہوتی ہے جو میسر نہ آئے تو افسانہ ہو یا نظم اس ہوائی جہاز کی مانند ہے جو رن وے پر دوڑتا ہے لیکن اُڑ نہیں پاتا۔ اڑان نہ بھرے تو ہوائی جہاز اور بیل گاڑی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ بہت سے جعل ساز

افسانے ہیں جن میں پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری، زبان کی چاشنی اور بہت سا مرچ مسالہ ہوتا ہے، لیکن ناکام رہتے ہیں کیوں کہ وہ دوڑتے ہیں لیکن ٹیک آف نہیں کرتے۔ اگر اڑان بھرتے بھی ہیں تو ٹوٹ کر پاش پاش ہوجاتے ہیں کیوں کہ ہوائی جہاز معمولی سا تکنیکی سقم بھی برداشت نہیں کرپاتا۔

تنقید اس معاملے میں بیل گاڑی ہی کی مانند سخت جان ہے۔ اول تو اسے ہوائی جہاز ہونے کا دعویٰ نہیں۔ وہ اپنی بھربھر چال چلتی رہتی ہے۔ دیکھا کہ فکر کے گڑھے میں پہیا پھنس گیا ہے تو وہ چار فلسفیوں کو بلالیا کہ لگادو دھکا۔ نظریے کی لاش بھاری ہوگئی ہے تو وہ چار نقادوں کو کندھا دینے کے لیے آواز دے دی۔ پانچ دس اشعار کو غل غپاڑہ مچانے والے چھوکروں کی طرح جمع کرلیا اور ان کے شور شرابے میں شاعر کا جلوس بیل گاڑی کا زمانہ آگے بڑھ گیا۔

تخلیق چوں کہ ایک اکائی ہوتی ہے، ہیئتی وحدت کی متقاضی اور فنکارانہ تکمیل کی جویا، اس لیے ایطائے خفی اور ایطائے جلی جیسی چھوٹی موٹی بیماریاں بھی اس کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ تنقید اس معاملے میں کافی مضبوط واقع ہوئی ہے۔ بڑی بڑی بیماریوں کو جھیل جاتی ہے۔ اس کی طبعی بیماری ضیق النفسی ہے جس میں لکھنے اور پڑھنے والوں کا سانس پھولتا رہتا ہے، لیکن ضیق النفس میں آدمی جیتا بہت ہے۔ نقاد اگر اپنی کتاب میں مرجاتا ہے تو دوسرے نقادوں کی کتاب میں زندہ رہتا ہے کیوں کہ اس کا ذکر نقادوں کو بہ ہر حال منظور ہوتا ہے۔ پھر اختلاف رائے نہ ہو تو تنقید ایک ایسا اکھاڑا ہے جس میں ورزش سب کرتے ہیں کشتی کوئی نہیں لڑتا اور کشتی نہ ہو تو طاقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ طاقتور نقاد نقادوں سے لڑتا ہے، کمزور نقاد کمزور شاعروں پر برستا ہے۔ طاقتور نقاد کمزور شاعروں کا ذکر رواداری سے کرتا ہے۔ ان پر اس کی کتاب کتبہ ثابت ہوتی ہے۔ وہ ادب میں مرجاتے ہیں لیکن ان کتابوں میں زندہ رہتے ہیں جو انھیں حیات جاوداں بخشنے کے کام میں خود جاں بحق ہوگئیں۔

تخلیق کی دنیا میں معمولی صلاحیت کے لوگ معمولی رہتے ہیں۔ فنکاری محض الہام و وجدان نہیں بلکہ جگر کاوی اور عرق ریزی بھی ہے، لیکن تخلیقی صلاحیت نہ ہو تو عرق ریزی رائیگاں ہے۔ تنقید میں الہام و وجدان جیسی کوئی چیز ہے تو وہ بصیرت ہے جو بجلی کے کوندے کی طرح نقاد پر فن پارے کی معنویت اور فنی رموز منکشف کردیتی ہے، لیکن بصیرت کا یہ کوندا انھیں گھنگھور گھٹاؤں میں لپکتا ہے جو جگر کاوی میں ڈوبے ہوئے نقاد کے خون گرم سے اٹھتی ہیں۔ بصیرت کے بغیر تنقید بھی رائیگاں ہے لیکن کوندا لپکے یا نہ لپکے، گھنگھور گھٹاؤں کا اپنا ایک لطف ہے۔ خصوصاً جب بدلیوں سے علم کی پھوار برسنے لگے تو ذہن سیراب ہوتا ہے۔ فنکار زندگی کے مشاہدے کو تخیل کے ذریعے ایک فنکارانہ تجربے میں بدل دیتا ہے اور اس تجربے میں زندگی کی حقیقت بھی ہوتی ہے، فنکار کی بصیرت بھی اور آرٹ کا حسن بھی۔ نقاد ادب کے مطالعے کو اپنے علم و دانش کے ذریعے ایک ناقدانہ تجربے میں بدلتا ہے اور اس تجربے میں نقاد کا علم، بصیرت اور ذہانت فن پارے کی معنویت اور حسن کاری کی کسوٹی بنتی ہے۔ فنکار کے لیے زندگی کا مشاہدہ ضروری ہے اور وہ آنکھ بھی جو ہر رنگ میں وا ہوجاتی ہے لیکن فنکار مشاہدے اور تجربے کی کمی کو اپنے تخیل کی طاقت سے پورا کرسکتا ہے۔ جتنے تجربات اور مشاہدات شیکسپیر کے ڈراموں، ٹالسٹائی کے ناولوں اور چیخوف اور موپاساں کے افسانوں میں بیان ہوئے ہیں انھیں حقیقی زندگی میں حاصل کرنے کے لیے فنکار کو سات جنم لینے پڑیں گے۔ نقاد کے پاس تخلیقی تخیل کی یہ قوت نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو اس کے کام نہیں آسکتی کیوں کہ وہ فن پارے کے فریم ورک میں قید ہوتا ہے۔ اسے وہی دیکھنا اور سمجھنا ہوتا ہے جو فن پارے میں موجود ہوتا ہے۔ اگر اسے کرداروں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے تو وہ دوسرے ڈراموں اور ناولوں کے کرداروں کے ساتھ کرتا ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ادب کا مطالعہ وسیع اور ژرف بیں ہو۔

فنکاری تخیل کی سحر آفرینی ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں جادو وہی جو سر پر چڑھ کر بولے، ورنہ شعبدہ ہے، کرتب ہے، ہاتھ کی چالاکی ہے۔ تنقید لفظی کرشمہ سازی کی روادار نہیں تو تخلیق کے ساتھ اس کا مقابلہ بے معنی ہے۔ تخلیق کے ساتھ اس کا رشتہ دیکھنا چاہیے اور یہ رشتہ تحسین، تفہیم، پرکھ اور دریافت کا ہے۔ تخلیق خام یا ناکام ہوتی ہے تو دریا برد ہوتی ہے اور بچنے کے لیے نقادوں کی طرف ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ نقاد ادب کا وہ ٹٹیری ہے جو علم کی لنگوٹی پہنے نظریے کی ایک ٹانگ پر کھڑا اس تیسری آنکھ کے کھلنے کا منتظر ہے جو خاشاک کے تودے میں در نایاب دیکھتی ہے، ایک تنکا اس کی طرف پھینک دیتا ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اسے مزید ڈبوتا ہے۔ تخلیق جب ڈوبتی ہے تو تنقید کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبتی ہے، وجود بچائے ادب کو خس و خاشاک سے پاک رکھنے کا قدرت کا اپنا طریقہ ہے۔

تنقید پر بڑی ذمہ داری آپڑتی ہے جب اسے باصلاحیت، کم صلاحیت اور بے صلاحیت لکھنے والوں کے درمیان تمیز کرنی پڑتی ہے۔ اس میں وہ ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتی کیوں کہ مذاق سلیم کا معاملہ بیلیس اور ہماگوت کے بیچ فرق کرنے کا نہیں بلکہ نفیس ترین انگوری شراب کو نوک زبان سے چکھ کر اس کی کشید اور کیفیت متعین کرنے اور اسے دوسری دو آتشہ اور سہ آتشہ سے ممیز کرنے کا ہے۔ تنقید بلانوشی سے پرہیز کرتی ہے کیوں کہ اس سے زبان کا احساس کند ہوتا ہے۔ لیکن ادب کے انگور کی کاشت ہی میں خرابی آگئی ہے، چنانچہ شاید اس کھاد کے سبب جو علامات اور اساطیر کے ملغوبوں سے تیار ہوتی ہے۔ وہ جو عام ادب جو سامنے آرہے ہیں اور جنھیں نوک زبان سے چھوئے بغیر ناک بند کیے براہ راست گلے میں انڈیلنا پڑتا ہے وہ سرور کم اور درد سر زیادہ دیتے ہیں۔ ان پر نقادوں کی تنقیدیں پڑھ کر درد سر تو دور ہوجاتا ہے لیکن دنیا سے دل اچاٹ ہوجاتا ہے۔ کیا فائدہ اس دنیا میں رہنے کا جس میں آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے زبان اسے جھٹلاتی ہے۔

کیا تنقید مسیحا نفسی کی دعویدار ہے؟ کیا اس کی شرح و تعبیر، سخن آفرینی، تحسین و تعریف سے مردہ شعر جی اٹھتے ہیں؟ اگر تنقید کے پاس یہ طاقت ہے تو کلیات میر جو ادھر ادھر نخلستانوں کے ساتھ لق و دق صحرا کا منظر پیش کرتا ہے، پھولوں سے مہکتی سرسبز و شاداب وادی بن جائے۔ پھر تو وہ ہزاروں اردو شعرا جو تذکروں کے چھوٹے بڑے قبرستانوں میں خواب ابد کی نیند سورہے ہیں، جاگ اٹھیں اور ان کے ہاتھ میں ان کا کتبہ ایسی کتاب بن جائے جس کی ہر غزل کا ہر شعر کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست کا منظر پیش کرے۔ آج کل جس دھڑا دھڑ انداز میں افسانوں کے تجزیے ہورہے ہیں وہ بھی نقاد کی مسیحا نفسی کے جرم کی شہادت دیتے ہیں۔ نقاد افسانے کے منہ سے منہ لگائے ہانپتے ہوئے اس میں سانس بھر رہا ہے، اس کے سینے پر گھونسے مار رہا ہے تاکہ افسانے کا قلب جو پیدا ہوتے ہی بند ہوگیا تھا نقاد کی نفسا نفسی سے پھر سے حرکت میں آجائے۔ مسیحائی کے روپ میں بھی نقاد کو احتیاط لازم ہے کہ اکثر جان ناتواں دم عیسیٰ بھی برداشت نہیں کرپاتی۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ نقاد صرف مستند لوگوں پر لکھا کرے۔ مستند لوگوں کو اس کی تنقید کی ضرورت نہیں کہ وہ تو اپنا لوہا منواچکے۔ وہ ابھرتے ہوئے فنکار جن کا مستقبل آئینہ فن یک الف بیش نہیں اس کی توجہ کے زیادہ مستحق ہیں کہ عدم توجہی کا شکار ہونے سے انھیں ہمدردانہ تنقید بچا سکتی ہے۔ لیکن یہاں بھی تنقید کو تنقید ہی رہنا چاہیے جو بے جا تعریف اور بونے کو باون گزا ثابت کرنے سے مختلف مزاج کی حامل ہوتی ہے۔ بالکوں پر لکھی تنقید نہیں کیوں کہ تنقید کا پہلا کام تو اہلیت اور صلاحیت کی شناخت ہی ہے۔ شناخت کے بعد اس کی نگہداشت اور پرورش ہے جو پھر ایک ناقدانہ عمل ہے جس میں سرپرستی اور سرزنش باہم پیوست ہوتے ہیں۔

سرزنش کا مطلب معائب بیان کرنا نہیں ہے۔ دراصل ہماری شاعری نے زبان و بیان کی اغلاط اور معائب کی گرفت کرنے والی تنقید کی جو روایت قائم کی ہے اس نے سرزنش کو عیب جوئی کے مترادف بنادیا ہے، حالاں کہ سرزنش کا مطلب ہے فنکار کو وسیع تر معنی میں آداب فن کی طرف متوجہ کرنا۔ اس کے تخلیقی تخیل کے لیے لائحہ عمل اور راہوں کی نشاندہی کرنا، اسے یہ جتانا کہ ان حالات میں اس کے فن کو موضوع اور ہیئت کی تنگ دامنی، کم عیاری اور گھٹن کے کن سے خدشات درپیش ہیں اور کیوں؟

ہمدردانہ طور پر کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بیان حوصلہ شکنی نہیں ہے۔ حوصلہ افزائی کے اقتدار کے تحت کمزوریوں اور کوتاہیوں سے چشم پوشی تنقید کے فرائض منصبی کی ادائیگی سے گریز کے ہم معنی ہے۔ زبان کی اغلاط کے بیان میں نقاد کی زبان دانی کی نمائش فنکار کی قیمت پر ہوتی ہے۔ یہ تنقید ان نقادوں کا فن سمجھا جاتا ہے جو فنکار کی قیمت پر اپنی قدر منوانا چاہتے ہیں۔ وہ بتانا یہ نہیں چاہتے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں بھی زبان و بیان کی غلطیاں ہوتی ہیں بلکہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کا زبان کا علم ان شعرا سے زیادہ مستحکم ہے۔ اور جب یہ شاعر انھیں طبعاً پسند نہ ہوں مثلاً جوش ان کے نزدیک لفاظ، فراق روایت سے بیگانہ اور فیض سیاسی دائرے کا اسیر ہو تو انھیں خاک بسر کرکے خود کو سرفراز کرنے کا تنقید ایک ناگوار ہتھکنڈا بن جاتی ہے۔ اسی لیے بت پرستی اور بت شکنی تنقید کو راس نہیں آتے۔ دونوں میں نقاد اپنی ہی شخصیت کا زعمانی ہے، آرتی اتارتے وقت اور گرز چلاتے وقت توجہ اپنی ہی طرف کھینچتا ہے جب کہ تنقید میں نقاد اپنی شخصیت کو فنکار میں فنا کرتا ہے کیوں کہ نقاد اس شمس کی مانند ہے جو فن میں فنا ہوکر ہی اپنی روشنی پاتا ہے۔

تنقید چاہتی ہے کہ اسے فن پارے کے حسن کا راز معلوم ہوجائے لیکن حسن چوں کہ اپنی فطرت ہی میں پُراسرار ہے اس لیے راز، راز ہی رہتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں فن شعر کے اصول اور قواعد پر مشتمل علوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے، لیکن ان علوم کے ماہرین نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ شعر کے حسن کا راز آہنگ میں ہے یا کسی بحر میں، یا ردیف، قافیہ یا صنائع لفظی یا معنوی میں ہے۔ ان اجزا کا حسین استعمال محاسن شعری کا سبب ہوسکتا ہے اور کوئی ایک خوبی حسن شعر کا سبب بھی ہوسکتی ہے لیکن کلی حیثیت سے شعر کا حسن اس کے تمام اوصاف کا مجموعہ بھی ہوگا اور ہمیشہ ان اوصاف سے کچھ نہ کچھ زیادہ ہوگا۔ یہ کچھ نہ کچھ زیادہ ہی وہ طلسمی کیفیت ہے جو ماورائے سخن رہتی ہے۔ جو کچھ فن میں ہے وہ بیان کیا جاسکتا ہے لیکن جو ماورائے فن ہے اسے محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ امر ہے جو تنقید کو فن پارے کے حسن کے حضور شوخ چشمی اور گستاخانہ دارو گیر کی بجائے عجز کاری کے آداب سکھاتا ہے۔ جدید تنقید کا یہ دعویٰ کہ اسے حسن شعر کا راز لفظ کے آہنگ یا اس کے جدلیاتی استعمال میں مل گیا ہے نقاد کو دانائے راز کا تاج دینے کی ایسی دلیرانہ کوشش ہے جس کی تنقید بھی دعویدار نہیں رہی۔

(باقی آئندہ)

***

اردو دنیا

اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف

ٹیچروں کی تقرری پر ناراضگی

نئی دہلی (۲۰ فروری)۔ راجدھانی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف پرنسپلوں اور اساتذہ کی تقرری پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے 'راشٹریہ ویمن اینڈ چلڈرن ویلفیئر آرگنائزیشن' نے سرکار اور محکمہ تعلیم سے ان پرنسپل اور اساتذہ کو فوری طور پر ہٹانے کا مطالبہ کیا ہے۔ تنظیم کی صدر انیس فاطمہ نے جعفرآباد میں منعقد ایک میٹنگ میں کہا کہ اردو کے تئیں ہمدردی اور اس کے فروغ کے لیے اقدامات کرنے کے دعوے والے تو بہت ہیں مگر حقیقت میں اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اس طرف دھیان کسی کا نہیں ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

15 اضلاع میں تلگو کے ساتھ اردو زبان پر عمل آوری کا مطالبہ

حیدرآباد (۱۵ فروری)۔ سابق وزیر جناب محمد علی شبیر نے ریاست کے چودہ اضلاع میں جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، تلگو کے ساتھ اردو زبان کو بھی روبہ عمل لانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ سرکاری زبان کمیشن جہاں تلگو کی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر روبہ عمل لانے میں سرگرم عمل ہو چکا ہے، اسے چاہیے کہ وہ تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی روبہ عمل لانے کے لیے اقدامات کرے۔ بالخصوص حیدرآباد میں کاروباری اداروں کے سائن بورڈ پر تلگو زبان میں تحریر کے لیے نوٹسیں جاری کی جا رہی ہیں اسی طرح اردو زبان پر عمل آوری کے لیے بھی انھیں پابند کیا جانا چاہیے۔ اردو زبان کے ساتھ ایک طویل عرصے سے امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔ کانگریس حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد سال ۲۰۰۵ میں ریاست کے تیرہ اضلاع حیدرآباد، عادل آباد، نظام آباد، میدک، ورنگل، رنگا ریڈی، اننت پور، کرنول، کڑپہ، چتور، نیلور، کھمم اور محبوب نگر میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیتے ہوئے جی او نمبر 306 مورخہ ۱۴ نومبر ۲۰۰۵ء جاری کیا گیا، بعد ازاں مزید دو اضلاع کریم نگر اور نلگنڈہ کا اضافہ کرتے ہوئے جی او نمبر 383 مورخہ کم جون ۲۰۰۷ء کو جاری کیا گیا اور اردو کے فروغ کے لیے مختلف اقدامات انجام دیے گئے، بالخصوص اردو اکیڈمی کے بجٹ کو دو کروڑ سے بڑھا کر تیس کروڑ تک کر دیا گیا تھا۔ محمد علی شبیر نے آج اپنی قیام گاہ پر اردو زبان کے مسئلے پر ایک اجلاس طلب کیا، جس میں چیئرمین وقف بورڈ مولانا سید شاہ افضل بیابانی، ایس کے افضل الدین (سابق نائب صدر اردو اکیڈمی)، ڈپٹی میئر راجکمار، کارپوریٹر واجد حسین، اقلیتی قائدین خواجہ ذاکر الدین، محمد منصور احمد، شکیل خان، ایم ایم بیگ، محمد نظام الدین، ظفر اقبال اور دوسروں نے شرکت کی۔ اجلاس میں عثمانیہ یونیورسٹی کے لوگو میں اردو عبارت کو حذف کرنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ محمد علی شبیر نے کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی جس کو نظام ہفتم میر عثمان علی خاں نے قائم کیا تھا، ملک کی پہلی اردو یونیورسٹی ہے۔ اس قدیم یونیورسٹی کے لوگو سے اردو تحریر کو ہٹانا افسوسناک ہے۔ محبان اردو اس کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ انھوں نے کانگریس اقلیتی قائدین کو ہدایت دی کہ وہ ایک وفد کی شکل میں وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی سے ملاقات کر کے اس سلسلے میں نمائندگی کریں اور ان کا ایک مکتوب بھی وائس چانسلر کے حوالے کریں۔ اگر لوگو کو بحال نہیں کیا گیا تو مستقبل کے لائحہ عمل کو قطعیت دی جائے گی اور چیف منسٹر سے بھی ملاقات کرتے ہوئے لوگو کی بحالی کے لیے نمائندگی کی جائے گی۔

(منصف۔ حیدرآباد)

نیا سیشن شروع ہونے کے باوجود

ہندی اور اردو میڈیم پرائمری اسکولوں کے بچوں کو کتابیں نہیں ملیں

آسنسول، مغربی بنگال (۲۰ فروری)۔ بایاں محاذ کے دور میں پرائمری اسکولوں میں تعلیم کا معیار کافی پست ہو گیا تھا اور جب ریاست میں ماں، ماٹی، مانش سرکار آئی تو یہ سمجھا گیا تھا کہ تعلیم میں سدھار آئے گا مگر افسوس کی بات ہے کہ پرائمری اسکولوں میں تعلیم کے معیار میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ پرائمری اسکولوں کے تئیں بالخصوص ہندی اور اردو میڈیم اسکولوں کے سلسلے میں سرکار کا وہی طریقہ ہے جو پہلے تھا۔ ان باتوں کا اظہار آج سمتران کونسل غلام سرور نے اپنے دفتر میں اخباری نامہ نگاروں کے سامنے کیا اور کہا کہ انھوں نے آج ہی ایک خط ڈی ایم کو روانہ کیا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ موجودہ اکاڈمک سیشن ۲ جنوری سے شروع ہو چکا ہے، مگر اب تک حکومت کی طرف سے اردو میڈیم پرائمری اسکولوں کے طالب علموں کو صرف ایک کتاب فراہم کرائی گئی ہے۔ کتابوں کی کمی کے سبب بچوں کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔ سمتران کونسل برائے تعلیم نے اپنے خط میں بحوالہ میمو نمبر 2464 بتاریخ ۱۰ جنوری سے ڈی ایم کو یہ شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ ہندی میڈیم اسکولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہاں درجہ اول کے طالب علموں کو اب تک کوئی کتاب نہیں ملی۔ درجہ دوم کو صرف ہندی اور حساب کی کتاب دی گئی ہے جب کہ درجہ سوم کے طالب علموں کو صرف حساب کی کتاب ملی ہے، یعنی کسی بھی درجے کو مکمل کتابیں فراہم نہیں کرائی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب کتابیں طالب علموں کو نہیں ملیں گی تو وہ پڑھائی کس طرح کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کی پڑھائی متاثر ہوگی اور دیگر زبانوں کے مقابلے میں ہندی اور اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری اسکولوں کے طالب علموں کا معیار بھی متاثر ہوگا۔ انھوں نے آج ڈی ایم کی اس جانب توجہ دلائی اور درخواست کی ہے کہ جلد از جلد کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

(آزاد ہند۔ کلکتہ)

بزم اردو جودھپور کے زیر اہتمام

'غالب: مختلف زبانوں میں' کے موضوع پر مذاکرے کا اہتمام

جودھپور (۱۶ فروری)۔ "ترجمہ دوسرے کی آنکھ کے خواب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ہنر ہے جس کے لیے لسانی تہذیب اور اسطوری معلومات کا ہونا نہایت ضروری ہے"۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے بزم اردو جودھپور اور سروکار کے زیر اہتمام غالب کی ۱۴۴ویں برسی کے موقعے پر منعقد مذاکرے 'غالب: مختلف زبانوں میں' کے صدارتی خطبے میں کیا۔ انھوں نے غالب کے فارسی اشعار کے ترجمے پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے اردو کو رنگ فارسی بخشا۔ غالب ہم عصر نہیں ہمہ عصر شاعر ہیں۔ ڈاکٹر سروج کوشل نے جگن ناتھ پانڈے کے سنسکرت ترجمے پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ ترجمہ نگار نے چابک دستی سے اس ہنر کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے ایک ہی لفظ کے مختلف مقامات پر مختلف معنی کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ بھی تخلیق ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر جاگرتی اپادھیائے نے دیوان غالب کے انگریزی ترجمے پر اپنے مقالے میں کہا کہ ترجمہ نہایت مشکل کام ہے، جس میں جذبے کی شدت کا برقرار رہنا ضروری ہے۔ انھوں نے ترجمے کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ راکیش موتھا نے ہندی ترجمے میں غالب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب شعور پر قابض ہو جاتا ہے اور ان کا لہجہ مایوسی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ خود کو جاننے کا ذریعہ ہے۔ راجستھانی شاعر اشوک جوشی کرانت نے اپنے مقالے میں غالب کی شاعری میں تجسس، انداز بیان اور ندرت کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ ڈاکٹر نثار راہی نے غالب کا سوانحی خاکہ پیش کیا۔ اس موقعے پر حبیب کیفی، اے ڈی راہی، کیلاش کبیر، برجیش امبر، پروفیسر کمبا لال، راج پروہت، ڈاکٹر پدم جا شرما، ساغر افتخاری اور محمد افضل جودھپوری وغیرہ موجود تھے۔ شین میم حنیف نے شکریہ ادا کیا۔ غالب کے فارسی، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور راجستھانی ترجمے پر مشتمل اس مخصوص مذاکرے کی نظامت اشراق الاسلام ماہر نے کی۔

(پریس ریلیز بزم اردو جودھپور)

میڈیکل داخلہ ٹسٹ میں اردو میڈیم طلبہ کی مشکلات پر اظہار تشویش

نئی دہلی (یکم فروری)۔ ممبر پارلیمنٹ پروفیسر سیف الدین سوز نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ جموں و کشمیر اور دیگر ریاستوں کے اردو میڈیم کے تقریباً پانچ ہزار طلبہ کو نیشنل ایلیجبلٹی کم انٹرنس ٹسٹ (NEET) میں شامل ہونے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اس سلسلے میں جموں و کشمیر کانگریس کے صدر پروفیسر سوز نے فروغ انسانی وسائل کے وزیر پلم راجو اور وزیر صحت غلام نبی آزاد کو خط لکھا ہے۔ انھوں نے دونوں وزرا سے درخواست کی ہے کہ وہ اردو میڈیم کے طلبہ کو اس امتحان میں شامل ہونے کی راہ نکالیں تاکہ وہ میڈیکل کے امتحان کے داخلہ ٹسٹ میں حصہ لے سکیں۔ اس سے قبل جب کہ ٹسٹ ملک گیر طور پر نہیں ہوتا تھا، بہار اسٹیٹ کی میڈیکل ڈائرکٹریٹ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کمیٹی دوسری زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی میڈیکل داخلہ ٹسٹ منعقد کرتی تھی۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

انٹر اردو میڈیم کی

نصابی کتابوں کی مفت تقسیم کا مطالبہ

حیدرآباد (۱۷ فروری)۔ محمد اعجاز الزماں (نائب صدر سٹی کانگریس اقلیتی ڈپارٹمنٹ حیدرآباد) نے جی او آر ٹی 18 کی اجرائی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح حکومت نے انٹر میڈیٹ کی نصابی کتب کی طباعت کے لیے 23 لاکھ 71 ہزار روپے منظور کیے ہیں اسی طرح کتب کی طباعت کے بعد سال اول اور سال دوم کے طلبہ میں نصابی کتابوں کی مفت تقسیم بھی عمل میں لائے۔ انھوں نے ڈائرکٹر/سکریٹری اردو اکیڈمی پروفیسر ایس اے شکور سے خواہش کی کہ وہ سرو سکشا ابھیان کی طرز پر جہاں اول تا دہم جماعت کی درسی کتابیں مفت فراہم کی جاتی ہیں، اردو میڈیم سے زیر تعلیم انٹر کے غریب طلبہ کے لیے بھی مفت کتابیں فراہم کرنے کے اقدامات کریں جو یقیناً اردو کی حقیقی خدمت اور اردو میڈیم کے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

(منصف۔ حیدرآباد)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

'ہماری زبان' کے مطالعے سے اردو سے متعلق بہت سی اہم خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں

مکرمی! دو تین ہفتے قبل 'ہماری زبان' کا شمارہ نمبر ۵ ملا۔ اس کے بعد اگلا شمارہ (۶) بھی نظر نواز ہوا۔ اس ہفت روزہ کے مطالعے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اردو سے متعلق بہت سی اہم خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یاد آیا کہ چند برس قبل قومی کونسل سے ترجمے کے لیے جو کتاب مجھے ملی تھی اس میں ایک پرچی آپ کے دستخط کی بھی تھی۔ شکریہ کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔

وشوا ناتھ طاؤس کا مضمون 'فلمی دنیا میں اردو کا سنہری دور' پڑھ کر خوشی ہوئی۔ حیدرآباد کے قادر علی بیگ تھیٹر فاؤنڈیشن نے 43 ویں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول آف انڈیا کا گوا میں افتتاح کیا تو وہاں دادا صاحب پھالکے کی بنائی ہوئی پہلی (گونگی) فلم راجہ ہریش چندر پیش کی گئی، اسے حیدرآباد میں بھی ان ہی دنوں دوبار پیش کیا گیا۔ اس کی بہت شہرت ہوئی۔ وشوا ناتھ طاؤس صاحب کے مضمون کو زیادہ سے زیادہ ہندی اور اردو کے میڈیا میں جگہ دی جانی چاہیے۔ آپ نے پہل کی ہے تو امید ہے کہ دوسرے بھی اسے لپک لیں گے۔

قدیر زماں

ملک پیٹ، حیدرآباد-۵۰۰۰۳۶

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام

ندا فاضلی کی کلیات 'شہر میں گاؤں' پر مذاکرہ

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'شام شہر یاراں' کے موقع پر معروف شاعر ندا فاضلی کی شعری کلیات 'شہر میں گاؤں' پر ۲۲ فروری ۲۰۱۳ء کو ایک علمی مذاکرے کا اہتمام پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں کیا گیا۔ مذاکرے میں جناب شاہد ماہلی، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر مولیٰ بخش اور ڈاکٹر رضا حیدر نے کلیات سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب شاہد ماہلی نے ندا فاضلی کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ندا فاضلی ہمارے اُن بڑے شعرا میں سے ہیں جنھوں نے انسانی قدروں کو اپنی شاعری میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا۔ ندا فاضلی کی شاعری جو تقریباً چالیس سالوں پر محیط ہے ان برسوں میں ندا فاضلی نے زمانے کے اہم ترین رجحانات کو بہت قریب سے دیکھا اور اُن رجحانات کے اثرات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنی گفتگو میں ندا فاضلی کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی نظموں میں بے بنا سے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور اُن الفاظ کے ذریعے سے نئے معنوں کو بھی خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ندا فاضلی کو ہم انسانی رشتوں کا شاعر بھی کہہ سکتے ہیں وہ اپنی شاعری میں رشتوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ کھوئے ہوئے لوگوں کی جستجو بھی ندا فاضلی کی شاعری کا اہم مظہر ہے۔ ماں کی ممتا اور اس کا پیار بھی ہمیں ندا کی شاعری میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے کہا کہ ندا فاضلی کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی شعری زبان آسان، سلیس اور عام فہم ہے اور ایسی ہی شاعری عوام سے فوراً رشتہ قائم کرلیتی ہے۔ فنی حیثیت سے بھی ندا فاضلی کی شاعری ایک اعلا درجے کی شاعری ہے۔ ڈاکٹر مولیٰ بخش نے کہا کہ ندا فاضلی اپنی شاعری میں زندگی کی حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندستان کی روایات اور تہذیب و ثقافت کو بھرپور طریقے سے پیش کیا ہے۔ قومی یکجہتی کا تصور بھی اُن کی شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ جلسے کے ابتدا میں ڈاکٹر رضا حیدر نے اس کلیات کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل ندا فاضلی کی یہ کلیات اُن کے اب تک کے تمام کلام کو سمیٹے ہوئے ہے جو چھ مجموعوں 'لفظوں کا پُل، مور ناچ، آنکھ اور خواب کے درمیاں، کھویا ہوا سا کچھ، شہر میرے ساتھ چل' اور 'زندگی کی طرف' پر مشتمل ہے۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمایا کہ ندا فاضلی کی شاعری ہمیں اس لیے اپیل کرتی ہے کہ انھوں نے زندگی کے تمام اہم معاملات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ صرف مشاعرے کے کامیاب شاعر نہیں ہیں بلکہ ادبی دنیا میں بھی ان کے کلام کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ پروفیسر قدوائی نے ندا فاضلی کی اس کلیات پر انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق کی دنیا کبھی ختم نہیں ہوتی اور اچھا شاعر ہمیشہ اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ ندا فاضلی کی شاعری میں جرأت مندی کا اظہار بھی ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاصر شعرا میں منفرد نظر آتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی اس ضخیم کلیات کو علمی اور ادبی دنیا میں احترام کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب مسعود فاروقی، ڈاکٹر ادریس احمد، ڈاکٹر سہیل انور، جناب محسن شمسی، محترمہ یاسمین فاطمہ اور محترمہ سفینہ کے علاوہ کئی اہل علم موجود تھے۔

(پریس ریلیز غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی)

انٹر اردو میڈیم نصابی کتب کی اشاعت کے لیے بجٹ منظور

حیدرآباد (۱۳ فروری)۔ حکومت نے انٹرمیڈیٹ سال اول کی اردو میڈیم سائنس اور میتھمیٹکس کی نصابی کتب کی طباعت کے لیے 23 لاکھ 78 ہزار روپے کا بجٹ جاری کیا ہے۔ اس سلسلے میں پرنسپل سکریٹری اقلیتی بہبود رانی کمودنی نے آج جی او آر ٹی 18 جاری کیا۔ جی او کے مطابق یہ رقم سکریٹری / ڈائرکٹر اردو اکیڈمی کو مالیاتی سال ۱۳-۲۰۱۲ء کے منصوبہ بجٹ کے تحت جاری کی گئی ہے تاکہ انٹرمیڈیٹ سال اول کے اردو میڈیم طلبہ کے لیے نصابی کتب شائع کی جائیں۔ اردو اکیڈمی کی جانب سے یہ نصابی کتب تلگو اکیڈمی کی نگرانی میں شائع کی جاتی ہیں اور حکومت اردو اکیڈمی کو امداد کے طور پر فنڈز جاری کرتی ہے۔ آئندہ مالیاتی سال کے بجٹ میں بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ اردو میڈیم کی نصابی کتب کی اشاعت کا کام تلگو اکیڈمی کی بجائے اردو اکیڈمی کو تفویض کی جائے۔ (سیاست، حیدرآباد)

اساتذہ کی تقرری میں اردو اساتذہ کی اسامیاں بہت کم

بیجاپور (۱۰ فروری)۔ محکمہ تعلیمات عامہ کی جانب سے پرائمری اساتذہ کی تقرری میں اردو اسکولوں کے ساتھ جانب داری برتی جارہی ہے۔ سرکاری نوٹیفکیشن کے مطابق ڈی ایڈ ٹیچرس کی تقریباً چار ہزار اسامیوں کی بھرتی سی ای ٹی کے ذریعے ہوگی جس میں اردو کی صرف 265 اسامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جب کہ اردو کے حلقے کہلانے والے اضلاع بشمول بیجاپور میں صرف دو یا تین اسامیاں بتائی گئی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر سال اردو اسامیوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ آنے والے سالوں میں اردو مدارس بند ہو سکتے ہیں۔

(سالار، بنگلور)

اک دیا اور بجھا

اردو کے معروف بزرگ شاعر جناب سید امین اشرف کا ۸ فروری ۲۰۱۳ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 90 برس تھی۔ اردو شاعری کے موجودہ منظرنامے پر سید امین اشرف کا نام نمایاں رہا ہے۔ ان کا وطن کچھوچھہ شریف تھا، ان کا تعلق خانوادۂ اشرفیہ سے تھا۔ خانوادۂ اشرفیہ کے بزرگ حضرت علی حسین اشرفی ان کے پرنانا تھے، جن کی فارسی اور اردو میں نعتیہ اور متصوفانہ شاعری اور ہندی کے عارفانہ کلام کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سید امین اشرف کی شاعری کے تین مجموعے 'جادۂ شب'، 'بہار ایجاد' اور 'قفس رنگ' کے نام سے شائع ہوئے۔ ۲۰۱۲ء میں ان کی نثری تحریروں کا ایک مجموعہ 'برگ دبار' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ وہ نظم اور غزل کے اعلا درجے کے تجربہ نگار تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ تھے جہاں سے وہ ۱۹۸۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں غالب ایوارڈ برائے شاعری سے سرفراز کیا گیا اور اترپردیش اردو اکیڈمی کا سب سے بڑا ایوارڈ بھی ان کو ملا تھا۔ ان کے فن پر ایک کتاب 'میزان حرف' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ام ہانی اشرف عبداللہ ویمنز کالج کے شعبۂ اردو میں ہیں جو خود بھی ادیبہ اور کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

ملک کے معروف شاعر، ادیب، صحافی اور عالم دین مولانا حامد الانصاری انجم کا ۱۸ فروری ۲۰۱۳ء کی صبح ساڑھے سات بجے ان کے آبائی وطن لوہرسن بازار ضلع سنت کبیر نگر، اترپردیش میں انتقال ہوگیا۔ وہ 84 برس کے تھے اور گزشتہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مولانا انجم انصاری کی علم و ادب کے میدان میں بڑی خدمات رہی ہیں۔ ان کے بارہ شعری مجموعے (بیشتر نعتیہ اور اسلامی شاعری کے مجموعے) شائع ہوئے ہیں۔ ملک کے معروف ادیب و شاعر حماد انجم ایڈوکیٹ، معروف صحافی سہیل انجم اور غلام بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر شمس کمال انجم ان کے صاحبزادے ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

سُرجاپور ہائی اسکول میں

بنگلہ اور اردو زبان و ادب کے لیے صرف ایک ایک استاد

چوپڑہ (۲۸ جنوری) گوال پوکھر دو نمبر بلاک (چوپڑہ) کے تحت سُرجاپور ہائی اسکول میں بنگلہ اور اردو زبان و ادب کی تدریس کے لیے صرف ایک ہی استانی اطلاعات موجود ہیں۔ غور طلب ہے کہ مذکورہ اسکول میں بنگلہ زبان و ادب کی پڑھائی کے لیے موجودہ ٹیچر انچارج مسٹر روبین بسواس ہیں۔ وہ اس عہدے پر پچھلے ۲۰۰۸ء سے فائز ہیں۔ مسٹر روبین بسواس کے دفتری کام کی وجہ سے بنگلہ زبان و ادب سے منسلک بچوں کی تعلیم پڑھائی دیگر سبجیکٹ کے مقابلے زیادہ متاثر ہورہی ہے۔ یہی حال اردو زبان و ادب کا بھی ہے، اس زبان کے لیے بھی اس اسکول میں ایک ہی استاد ہے، جانکاری کے مطابق اس اسکول میں دو ہزار سے زائد بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں، دونوں میڈیم کے بچوں کا تناسب آدھا آدھا ہے لیکن ٹیچر انچارج کی کوتاہی کی وجہ سے بچوں کی پڑھائی متاثر ہورہی ہے۔ ذرائع کے مطابق ٹیچر انچارج روبین بسواس کا فرض تھا کہ بچوں کی تعداد کا خیال رکھتے ہوئے اساتذہ کی جو کمی ہے اسے پورا کرنے کے لیے متعلقہ اعلا حکام کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ مقامی ذرائع نے کہا کہ ایسی خبر ملی ہے کہ سُرجاپور ہائی اسکول کے ٹیچر انچارج اساتذہ کی کمی کے بارے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : فہم کا وسیلہ
مرتب : سندھیا سنگھ
مترجم : محمد فاروق انصاری
اشاعت : ستمبر ۲۰۱۲ء
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
تبصرہ نگار : محمد اکبر

زیرِ نظر کتاب 'فہم کا وسیلہ' ہندی زبان میں شائع دستاویز 'سمجھ کا مادھیم' کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم ڈاکٹر محمد فاروق انصاری ہیں۔ یہ دستاویز ان قومی مباحث کا حاصل ہے جو اسکول کے روزانہ کے معمول میں زبان سے متعلق بچوں کے تجربات کے تجزیے اور زبان کے استعمال کے سلسلے میں تعلیمی پالیسی پر ازسرِنو غور کرنے کی غرض سے ملک کے مختلف علاقوں میں منعقد کرائے گئے تھے۔ این سی ای آر ٹی کی جانب سے ان قومی مباحث کا انعقاد ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۰ء کے درمیان کیا گیا تھا۔ اس طرح اس دستاویز کی مدد سے زبان سے متعلق پالیسیوں اور پروگراموں کو جانچنے، پرکھنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے:

"...سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ بچوں کی اپنی زبان ہی فہم کا وسیلہ بنے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل اس پر عمل پیرا ہونے کی ہے... اس سمت میں ایک منظم تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف تعلیمی بلکہ سماجی اور انتظامی کردار کو لے کر ایک شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور فہم کے وسیلے سے متعلق سمجھ بنانے کے لیے عملی کوشش بھی لازمی ہے..."
(فہم کا وسیلہ، ص ۸)

یہ کتاب پانچ ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تعلیم سے متعلق دستاویزوں میں زبان کی ضرورت اور اہمیت سے بحث کرتا ہے۔ اس باب میں تعلیمی کمیشن کی رپورٹ ۶۶-۱۹۶۴ء، قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۶ء، پروگرام آف ایکشن ۱۹۹۲ء، قومی درسیات کے خاکے ۱۹۸۸ء، ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۵ء اور اے پی پٹنائک رپورٹ ۱۹۸۶ء میں زبان کی تعلیم سے متعلق سفارشات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے جس میں سہ لسانی فارمولا بھی شامل ہے۔ ان دستاویزات کی تمام تجاویز کے باوجود تقریباً ۶۵ سالوں کے بعد بھی زبان کی تعلیم کا مسئلہ جوں کا توں بنا ہوا ہے:

"کاغذ پر تو ذریعۂ تعلیم کی زبانوں کو لے کر سفارشات اور خاکے موصول ہوتے ہیں لیکن یہ گھر کی زبان اور اسکول کی زبان کے درمیان فرق کو اب بھی ختم نہیں کر سکے ہیں"۔
(فہم کا وسیلہ، ص ۷)

آگے چل کر یہ حقیقت بھی ظاہر کی گئی ہے:
"روز بروز ایک جانب گھر کی زبان اور اسکول کی زبان کے درمیان فرق بھی بڑھتا چلا گیا ہے تو دوسری جانب انگریزی سمیت ہندوستانی زبانوں کے درمیان رابطہ بھی ٹوٹ گیا ہے"۔
(فہم کا وسیلہ، ص ۸)

دوسرے باب میں زبان اور فہم کے رشتے کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور اس تلخ حقیقت کو بدلنے پر زور دیا گیا ہے کہ بچہ پہلی مرتبہ اسکول آتا ہے تو اسے یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنی زبان ٹھیک نہیں ہے۔ اسی زبان میں بات کرنا ہے جو اساتذہ کی طے کی ہوئی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں اس نے ابھی تک نہ سوچا ہے اور نہ بولا ہے۔ اس کا نتیجہ بے حد خطرناک ہو سکتا ہے:

"ہمیں غور کرنا ہوگا کہ بچہ اپنے آپ کو مادری زبان میں ہی پاتا ہے اور اپنے تجربات کی تشریح بھی اسی زبان میں کرتا ہے۔ تعلیم میں اس سے انکار کرنا محض بچے ہی سے انکار کرنا نہیں ہے بلکہ یہ سماجی مساوات، سماجی انصاف اور آزادی سے بھی انکار کرنا ہے۔ یہ رویہ ناشناسی کی روایت کے ساتھ ساتھ ایک پُرتشدد سماج کو جنم دے گا، کیوں کہ جب الفاظ نہیں رہتے تب ہتھیار اٹھتے ہیں"۔
(فہم کا وسیلہ، ص ۱۲،۱۱)

تیسرے باب میں کثیر لسانیت اور اس سے درپیش چیلنج کو دائرۂ بحث میں لایا گیا ہے۔ کثیر لسانیت ہماری زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ ہمارا ملک بھی کثیر اللسان ہے اس طرح ہم سب کثیر لسانی ہیں اور کثیر لسانی ہونا ہمیں دوسروں سے جڑنے میں اور ان کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ کبیر ایک کثیر لسانی صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے سدھکڑی زبان کا استعمال کیا۔ حبیب تنویر کا مشہور ڈراما 'آگرہ بازار' اور بھکاری ٹھاکر کا 'بدیسیا' کثیر لسانیت کی ہی بہترین مثالیں ہیں۔

چوتھے باب میں مختلف مضامین کو پڑھنے پڑھانے میں زبان کے استعمال کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ تمام مضامین کا استاد زبان کا استاد ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زبان محض ترسیل کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک وسیلہ بھی ہے جس کی مدد سے ہم بیشتر معلومات حاصل کرتے ہیں۔ خواہ ہم فطرت کا نظارہ کریں یا سماج کو سمجھنے کی کوشش۔ غور وفکر کی آزادی اور تخلیقیت کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

"گاندھی جی نے نئی تعلیم کا منصوبہ بناتے وقت اپنے ایک دوست کی پاٹھ شالا میں بچوں سے سوال کیا: ایک شخص ایک سیب چار آنے میں خریدتا ہے اور اسے ایک روپے میں فروخت کرتا ہے تو اسے کیا حاصل ہوگا؟ گاندھی جی کا ماننا ہے کہ بچے اگر جواب میں یہ نہیں کہتا کہ اسے جیل ملے گی تو وہ یقیناً زبان کو حساب سے تال میل بنا کر دیکھنے والا آزاد ہندوستان کا بچہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بچے کو ایسی آزادی دینی پڑے گی جس میں وہ اپنی زبان میں اپنی بات ظاہر کر سکے"۔
(فہم کا وسیلہ، ص ۲۸)

پانچویں اور آخری باب میں زبان کو فہم کے وسیلے کے طور پر عملی جامہ پہنانے کے لیے درپیش مسائل اور چیلنجز کا ذکر کیا گیا ہے۔ تمام مسائل اور ان کے حل کو دستاویز کی تیاری، سماجی تیاری اور انتظامی تیاری کے زمروں میں رکھ کر بحث کی گئی ہے۔ آخر میں ریاستوں میں مختلف سطحوں پر ذریعۂ تعلیم کے طور پر مستعمل زبانوں کو جدول کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس سے مختلف ریاستوں میں ابتدائی، ثانوی اور اعلا ثانوی سطحوں پر زبانوں کے استعمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر فاروق انصاری نے اس اہم دستاویز کا اردو ترجمہ پیش کرکے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ ان کی یہ کوشش نہ صرف قدر و منزلت حاصل کرے گی بلکہ زبان کے مطالعے اور ہمارے تعلیمی نظام میں زبان کی پوزیشن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ این سی ای آر ٹی کی روایت کے مطابق کتاب کی پیش کش اور طباعت بے حد عمدہ ہے۔

•••

نام کتاب : بادِ نو بہار
(دیارِ ہند میں فیض)
مرتب : ظہور صدیقی
ضخامت : ۱۸۳ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
۵-نہرو بھون، انسٹی ٹیوشنل ایریا، فیز II، وسنت کنج
نئی دہلی–۱۱۰۰۷۰
تبصرہ نگار : دیپک بدکی

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں فیض احمد فیض برصغیر ہند و پاک میں نہ صرف اپنی شاعری کے لیے جانے جاتے ہیں بلکہ انھوں نے عوامی انقلاب کی خاطر اپنا تن، من اور دھن سب کچھ قربان کر دیا اور عمر کا قیمتی حصہ پاکستانی جیلوں میں گزارا۔ ہندوستان اور پاکستان کی مختلف زبانوں خاص کر ہندی کے کئی شعرا فیض کی شاعری سے متاثر ہو کر ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ فیض کی شاعری جوں کی توں ہندی میں بھی چھپتی رہی اور دلوں کو گرماتی رہی یہاں تک کہ کئی ہندی رسالوں نے حال ہی میں ان پر خصوصی جشنِ شتی نمبر شائع کیے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ہندوستانی ادب سیریز کے تحت ہندی ادب پر فیض کے اثرات کی نشان دہی کرنے اور فیض کے بارے میں ان کے ہم عصر ہندی ادیبوں کے تاثرات جاننے کے لیے ظہور صدیقی کی ادارت میں مذکورہ بالا کتاب مرتب کروائی ہے جس میں ڈاکٹر اسلم پرویز کے دیباچے کے علاوہ تین برگزیدہ شخصیات کے انٹرویو، ہندی کے سولہ اہلِ قلم حضرات کے مضامین اور فیض کے چند خطوط کے اقتباسات درج کیے جا چکے ہیں۔ زیادہ تر مضامین کا ترجمہ ظہور صدیقی نے ہی کیا ہے۔ بقول صدیقی "اس کتاب کا مقصد ہندی دانشوروں کے قلم سے لکھی ہوئی فیض شناسی کو روشناس کروانا ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ الفت کی لہروں کو ایک بار پھر موجزن کرنا ہے"۔

فیض کا جنم سیالکوٹ میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو ہوا۔ تعلیم کے دوران ہی وہ روسی انقلاب اور روس کے کلاسیکی ادب سے متاثر ہوئے۔ انگریزی میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد امرتسر میں ۱۹۳۴ء میں لیکچرر بن گئے۔ ان کی ابتدائی شاعری رومانی تھی مگر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی شاعری میں حقیقت پسندی، بغاوت اور انقلابی و اشتراکی جذبہ پیدا ہو گیا۔ شاعری کے علاوہ وہ ایک کامیاب صحافی اور مزدوروں کے سربراہ بھی رہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم "ذاتی حیثیت سے وہ بے حد نرم مزاج، نرم گفتار اور بردبار قسم کے انسان تھے" جب کہ بقول منوہر "سفاری سوٹ پہنے ٹھیک افسر یا منیجر لگتے تھے"۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے مگر وہاں پر انھیں بہت ساری صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک راولپنڈی کیس کے تحت ملک سے غداری کے الزام پر قیدِ تنہائی ہوئی پھر ۱۹۵۸ء میں تنقیدی تبصرے لکھنے پر دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ظہور صدیقی فرماتے ہیں: "دراصل فیض پاکستان کے دکھی معاشرے کی ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کی آواز بن گئے اور آج بھی ہر جگہ یہ آواز گونج رہی ہے"۔ ان کی شاعری میں انفرادی سوز، اجتماعی آہنگ، وطن پرستی (ترواسن) کا درد، محنت کشوں اور مظلوموں سے ہمدردی، حب الوطنی اور بین الاقوامیت ملتی ہے۔ فیض کے شعری مجموعوں کے نام یوں ہیں: نقشِ فریادی (۱۹۴۳ء)، دستِ صبا (۱۹۵۲ء)، زنداں نامہ (۱۹۵۶ء)، دستِ تہِ سنگ (۱۹۶۵ء)، میرے دل میرے مسافر اور سرِ وادیِ سینا۔ ان مجموعوں کو 'نسخہ ہائے وفا' کے عنوان سے کلیات میں جمع کیا گیا ہے۔ فیض ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔

زیرِ نظر کتاب سے نہ صرف فیض کی زندگی کے بارے میں جانکاری ملتی ہے بلکہ ان صعوبتوں کا بھی علم ہوتا ہے جو تقسیمِ ملک کے بعد فیض اور ان کی اہلیہ کو جھیلنی پڑیں۔ فیض کی شاعری کے مقصدی اور جمالیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مضمون نگاروں نے فیض کی ہمہ گیر شخصیت کو ہندی قارئین کے سامنے پیش کرنے میں معروضیت اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے اور پھر ان مضامین کو اردو میں ترجمہ کرنے سے ان کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مضامین سے صاف ظاہر ہے کہ فیض ہندی دنیا میں اتنے ہی مقبول ہیں جتنے اردو دنیا میں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے اور امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔

•••

بقیہ: کچھ ادب اور فلم کے تعلق سے

صفحہ ۲ سے آگے

شکیلہ، جاگیردار، جتا گشی، کے این سنگھ، جال مرچنٹ اور گلاب نے اس میں اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ مکالمے جال مستری کی اور موسیقی ایس ڈی برمن کی تھی۔ فالی مستری اس کے ہدایت کار تھے۔ بھی گیت ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے جو اردو کی فلمی شاعری کا بہترین نمونہ تھے۔ ملاحظہ فرمایئے:

جل کے دل خاک ہوا آنکھ سے رویا نہ گیا
زخم ایسا ہے کہ ... دکھایا نہ گیا
...

محبت بھی تجارت ہو گئی ہے اس زمانے میں
اگر یہ راز دنیا کو بتا دیتے تو کیا ہوتا
تیری امید پہ جینے سے حاصل کچھ نہیں لیکن
اگر یوں بھی دل کو آسرا دیتے تو کیا ہوتا

جب دنیا بدلی ہے پھر کیوں نہ بدلیں ہم
کھلتے ہوئے موسم میں کیوں بیتی رت کا غم
جو بیتی بیت گئی، اب اس کو یاد نہ کر
رنگین بہاروں کو یوں ہی برباد نہ کر
ان نازک گھڑیوں کی عمریں ہوتی ہیں کم
جب دنیا بدلی ہے پھر کیوں نہ بدلیں ہم
چاہت کے گلشن سے خوشیوں کے موتی چن
کچھ اپنے دل کی کہہ کچھ میرے دل کی سن
یہ دوری کیسی ہے، میں پھول ہوں تو شبنم
جب دنیا بدلی ہے پھر کیوں نہ بدلیں ہم

■◆■

بقیہ: مولانا ضیاء الدین اصلاحی...

صفحہ ۸ سے آگے

موزخانہ شعور کے اس تجربے و مطالعے سے خود مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی سیرت و تاریخ نویسی کے اصولوں پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی تنقید کے تو قائل تھے البتہ تنقیص شبلی کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ان پر کئی تنقیصی مضامین نکلے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی کتاب 'مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار' شائع ہوئی جس میں انھوں نے وہی اعتراضات جو اس سے پہلے وہ اپنے تحقیقی مقالے میں کر چکے تھے، دہرائے تو مولانا ضیاء الدین صاحب نے مستشرقین کا نام لیے بغیر ان پر سخت تنقید کی اور لکھا کہ:

"دنیا کے اکثر عبقریوں اور نابغہ روزگار اشخاص کی طرح علامہ شبلی کو بھی اپنی عبقریت اور غیر معمولی ذہانت و قابلیت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی... مانا کہ کسی واقعہ کے بیان میں یا کوئی سن تاریخ لکھنے میں ان سے سہو ہوا ہو کیوں کہ ان کے زمانے میں وہ بہت ساری کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں جو اب عام ہو گئی ہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے بعض معاصرین نے بھی محض رشک وحسد کی بنا پر ان پر اعتراضات کیے ہیں اور بعض کوتاہ قامت لوگوں نے اپنا قد اونچا کرنے کے لیے ان کو مطعون کیا ہے یہی وجہ ہے کہ سخت اعتراضات اور شدید تنقیدوں کے باوجود علامہ شبلی کی عظمت و جلالت میں فرق آیا اور نہ ان کی تصنیفات کی شہرت و مقبولیت میں کمی آئی۔ سیرۃ النبی اور الفاروق سے لے کر ان کی ہر ہر کتاب پر خواہ مخواہ نکتہ چینی کی گئی لیکن کیا ان الٹے سیدھے اعتراضات کی وجہ سے کسی کتاب کو وقعت ہو گئی؟

ماضی میں علامہ شبلی اور ان کی تصانیف پر جو نکتہ چینیاں ہوئی ہیں وہ اب لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں لیکن بعض بعض حلقوں سے اب بھی انہی اعتراضات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے مگر یہ اعتراضات یا تو برائے اعتراض ہوتے ہیں یا اپنے پست قد کو بلند کرنے کے لیے... یہ لوگ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ ان کے لغو و لاطائل اعتراضات سے علامہ کے تعلیمی نظریات منہدم ہو جائیں گے اور ان کی کتابوں کی عالم گیر شہرت و مقبولیت ختم ہو جائے گی جس کا اثر لامحالہ ندوہ اور دار المصنفین پر بھی پڑے گا یہی وجہ ہے بعض حضرات علامہ کے تعلیمی خیالات پر اور ایک صاحب علم و تحقیق کے نام پر ان کی سب سے مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی پر اعتراضات کی بوچھار کر رہے ہیں لیکن ہم ان مدعیان علم و تحقیق کا قد اونچا کرنے کے لیے 'معارف' کے صفحات اور نہ اپنے رفقا کا قیمتی وقت ضائع ہونے دیں گے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس ہستی کو تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے جس نے ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام کو بھی اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پر شور رکھا۔"

(معارف جولائی ۱۹۹۵ء ص ۳-۴)

مستشرقین کے لغو و لاطائل اعتراضات کی تردید و تصحیح علامہ شبلی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

"وقت کی نباضی اور زمانہ شناسی علامہ شبلی کا طغرائے امتیاز تھا۔ انیسویں صدی میں اسلامی دنیا یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ہی اس کی ذہنی غلامی میں بھی گرفتار ہو گئی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا تھا۔ ان کا اصل نشانہ یہاں کے مسلمان تھے جن پر وہ مختلف سمتوں سے حملے کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ ضرر رساں حملہ مستشرقین کا تھا جو عربی زبان اور اسلامی علوم کے ماہر تھے۔ یہ اسلامی لٹریچر سے غلط اور غیر معتبر واقعات کو ڈھونڈھ کر اور صحیح روایات میں تدلیس و ملمع سازی کر کے انھیں ایسی بدنما شکل میں پیش کر رہے تھے کہ خود مسلمانوں کو بھی اپنے مذہب اور تاریخ سے گھن آنے لگی تھی اور ان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہی اعتراضات تیزی سے پھیل کر ان کے عقیدہ کو متزلزل کر رہے تھے۔ اس چیلنج کو قبول کر کے اسلام کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے والے علامہ شبلی ہی تھے۔"

(ماہنامہ معارف، اگست ۱۹۹۵ء، ص ۸۳)

اس سلسلے کی ان کی ایک اور اہم خدمت ان اجلاسوں اور سیمیناروں میں شرکت اور نمائندگی ہے جو مقامی اور ملکی پیمانے پر علامہ شبلی پر منعقد ہوئے۔ اس میں شرکت وہ اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ وہ نہایت اہتمام سے شریک ہوتے۔ مقالات پیش کرتے۔ صدارت کرتے اور افکار شبلی کی توضیح و تشریح میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

غرض یہ کہ شبلی شناسی اور شبلی کے افکار و خیالات کی ترویج و توسیع میں انھوں نے اس قدر اہم حصہ لیا کہ خوردان کے اپنے آرا و خیالات پر پردہ پڑ گیا۔ ضرورت ہے کہ علامہ شبلی کی شخصیت اور علمی و عملی کارناموں پر انھوں نے جو مضامین و مقالات سپرد قلم کیے ہیں انھیں یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جائے اس سے شبلیات ذخیرہ شبلیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

افادیت کے پیش نظر علامہ شبلی نعمانی سے متعلق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے مقالات کا اشاریہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

[۱] علامہ شبلی کی شعر فہمی، سہ ماہی نظام القرآن، سرائے میر، اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۲ء
[۲] مولانا شبلی کا ادبی پایہ، ماہنامہ آجکل، دہلی، اپریل ۲۰۰۳ء
[۳] مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات، مشمولہ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۳۰-۱۸۲
[۴] علامہ شبلی کے ایک شاگرد عبدالسلام ندوی، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، جولائی ۲۰۰۳ء
[۵] مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شبلی، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ [جوہر نمبر] فروری-اپریل ۲۰۰۵ء
[۶] شبلی و آزاد کے تعلقات، مشمولہ مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۶۷-۱۷۷
[۷] علامہ شبلی اور اعظم گڑھ، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۷ء
[۸] علامہ شبلی کے بعض جاودان کارنامے، مشمولہ علامہ شبلی نعمانی معنویت کی بازیافت، ۴۰-۷۰
[۹] علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۰۲ء
[۱۰] علامہ شبلی کی کردار سازی اور مردم گری، سہ ماہی نظام القرآن، سرائے میر، جولائی-ستمبر ۲۰۰۳ء
[۱۱] علم و مطالعہ سے مولانا شبلی کی دلچسپی، مشمولہ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۸۳-۱۹۴
[۱۲] مولانا شبلی کی علمی تربیت اور مردم سازی، مشمولہ مسلمانوں کی تعلیم، ص ۱۹۵-۲۱۷
[۱۳] علامہ شبلی اور علم حدیث، ماہنامہ الشارق مظفرپور، جولائی - دسمبر ۲۰۰۷ء
[۱۴] علامہ شبلی کی بعض اولیات، سہ ماہی نظام القرآن، سرائے میر، جنوری - مارچ ۲۰۰۸ء
[۱۵] کتابوں اور کتب خانوں سے مولانا شبلی کی دلچسپی، سہ ماہی نظام القرآن، سرائے میر، اپریل - جون ۲۰۰۲ء
[۱۶] دار المصنفین کی بنیاد کس نے ڈالی؟، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۷ء
[۱۷] ڈاکٹر ذاکر حسین اور دار المصنفین، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۰ء
[۱۸] الفاروق ایک مطالعہ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جون ۲۰۰۱ء
[۱۹] سفرنامہ روم و مصر و شام، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۹۵ء
[۲۰] مولانا نادم مولانا شبلی کی نظر میں، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اکتوبر، نومبر ۲۰۰۷ء
[۲۱] سیرۃ النبی میں علامہ شبلی کی ادبی رعنائی و گلکاری، فکر و نظر، علی گڑھ، شبلی نمبر جون ۱۹۹۶ء
[۲۲] علامہ شبلی اور سیرۃ النبی کی تالیف، ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ، اگست، ستمبر ۱۹۹۱ء
[۲۳] مولانا شبلی اور ان کی سیرۃ النبی پر تعجب خیز تنقیدیں، ندائے ملت لکھنؤ، ۱۰ ؍ نومبر ۱۹۸۵ء
[۲۴] علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم ایک مطالعہ، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۳ء
[۲۵] اضافہ و تصحیح (مکاتیب شبلی)، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مئی ۲۰۰۶ء

■◆■

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

میں محکمہ تعلیم کو آگاہ کر چکے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ذرائع نے کہا کہ اگر انھوں نے اپنے اعلا حکام کو اس کے لیے لکھا ہے تو اساتذہ کی بحالی اب تک کیوں نہیں ہوئی۔ اردو کو چھوڑیے کم سے کم بنگلہ ٹیچر کی بحالی تو ہو ہی جاتی، بنگلہ زبان کے لیے محکمہ تعلیم کے حکام کسی کوتاہی کا مظاہرہ تو نہیں کرتے لیکن اب تک اساتذہ کی بحالی نہیں ہو پائی ہے اس کا سیدھا مطلب ہے کہ مسٹر روبین بسواس کی طرف سے اساتذہ کی کمی دور کرنے کے لیے کوئی موثر پہل نہیں ہوئی ہے۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی بطور شبلی شناس

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (رفیق اعزازی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

فکر شبلی کی توسیع و ترویج میں جن ارباب کمال کا نمایاں حصہ ہے اس میں ایک اہم نام مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کا بھی ہے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح کے نامور فرزند تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اس نہج پر ہوئی تھی جس پر بڑی حد تک مولانا شبلی کے تعلیمی افکار کی مہر ثبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فکر شبلی کے حامل اور ترجمان کی حیثیت سے روز اول سے نمایاں ہوئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۶ء میں وہ دار المصنفین کے رفیق منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں ناظم اور ماہنامہ 'معارف' کے مدیر مقرر ہوئے اور آخری سانس تک اسی ادارہ کے خدمت گزار اور فکر شبلی کے ترجمان رہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ وہ تاریخ دار المصنفین کے اکبر اعظم تھے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس طویل مدت میں انھوں نے تقریباً ایک درجن کتابیں، متعدد مقالات، دو سو سے زائد وفیات، ڈھائی سو کے قریب شذرات، ہزاروں کتابوں پر نقد و تبصرہ اور متعدد کتابوں پر مقدمے اور دیباچے لکھے۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا حق ادا کر دیا لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ان علمی و تصنیفی کاموں میں ان کا وہی نہج نظر تھا جو دبستان شبلی کا طرۂ امتیاز ہے۔ مقالہ نگاری کا وہی انداز جس کا آغاز شبلی نے کیا تھا اور جسے دبستان شبلی کے ممتاز اہل قلم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی اور دیگر رفقائے دار المصنفین نے رواج دیا۔ وفیات اور شذرات میں بھی وہی نہج و اسلوب اور تصنیف و تالیف کا وہی طرز جو انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا۔ تنقید و تحقیق میں بھی انھوں نے اپنے بزرگوں کی روش ہی کو ملحوظ رکھا۔ یہ تو اسلوب و انداز کی بات تھی افکار و خیالات میں بھی شبلی و سلیمان کے نظریات کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے، جس کا خود انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی علامہ شبلی کے بڑے والہ و شیدا تھے، ان کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ تصانیف شبلی کو بار بار پڑھتے بلکہ اس قدر کثرت سے پڑھا کہ ان کے اقتباسات یاد ہو گئے تھے اور جملے کے جملے زبان پر چڑھ گئے تھے۔ انھوں نے شبلی، تصانیف شبلی اور افکار شبلی کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا جس پر ان کی تحریریں شاہد ہیں۔ انھوں نے شبلی کی تصنیفات اور ان کے افکار و خیالات اور ان کے اسلوب و خصوصیات پر متعدد مضامین و مقالات لکھے۔ ان کا آخری طویل مقالہ بھی علامہ شبلی نعمانی ہی سے متعلق ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو کے معاصرین میں شبلی سب سے بلند رتبہ شخصیت کے حامل تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی ملک کے بہت ممتاز عالم، ادیب و انشا پرداز اور اردو کے مشہور و مقبول مصنف تھے۔ ممکن ہے بعض حیثیتوں سے دوسروں کو ان پر اولیت حاصل رہی ہو، وہ خود بھی مولانا محمد حسین آزاد کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کہتے تھے لیکن تعصب اور ادبی گروپ بندی سے الگ ہو کر اگر دیکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے علامہ کا رتبہ ان کی جامعیت کی وجہ سے اردو کے معاصرین میں سب سے ممتاز نظر آئے گا۔"

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۹۵ء)

علامہ شبلی کی عظمت و جامعیت ان کی کتاب زندگی کا سب سے روشن باب ہے۔ مولانا مرحوم نے ایک علاحدہ مقالے میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور دکھایا ہے کہ علامہ شبلی میں کون کون سی خوبیاں تھیں۔ یہ بحث سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے مضمون 'شبلی کے کام کی مجموعی قدر و قیمت' میں اٹھائی تھی۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے زیادہ مضبوط دلائل سے اس کو واضح کیا ہے۔ یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں پیش کیا گیا اور بعد میں 'معارف' نومبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کی ذات مجموعۂ کمالات اور ان کی زندگی گوناگوں علمی و ملی کارناموں کا مرقع ہے۔ ان کے قلم نے علم و مذہب، تاریخ، سوانح، تعلیم و اخلاق، سیاست، کلام، فلسفہ، شعر و ادب اور تنقید و تحقیق ہر میدان میں اپنے تابناک نقوش چھوڑے ہیں۔"

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۰۲ء ص ۳۳۱)

وہ جب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کے انتقال (۱۸ نومبر ۱۹۸۷ء) کے بعد ۱۹۸۸ء میں دار المصنفین کے ناظم ثانی اور ماہنامہ معارف کے مدیر بنائے گئے تو سب سے پہلے انھوں نے بانی دار المصنفین کی تصنیفات کو نہایت اہتمام کے ساتھ تحقیق و مراجعت کے بعد شائع کیا۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق متعدد کتابوں کے اشاریے تیار کرائے۔ تصحیح و تحقیق اور خاص طور پر حوالوں کی تحقیق، تخریج اور ضروری حواشی خود لکھے اور اپنے رفقا سے لکھوا کر انجامی تحقیقی ایڈیشن شائع کیے اور ان کتابوں پر ایک ایک، دو دو صفحے کے انھوں نے جو دیباچے لکھے ہیں، ان کے ایک ایک حرف سے علامہ شبلی سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرۃ النبی ﷺ کی تمام جلدوں کے ایک خوبصورت ایڈیشن کی طباعت و اشاعت ہے، جو اس کے پہلے کی تمام اشاعتوں کے مقابلے میں زیادہ محقق اور زیادہ خوب صورت ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی تعلیم پر گہری نظر تھی۔ انھوں نے تعلیم اور تعلیمی افکار و نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کے متعدد تعلیمی اداروں اور دینی مدارس کے رکن تھے۔ وہ تعلیم و تدریس، نصاب تعلیم اور اس کی افادیت وغیرہ پر اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔ متعدد تعلیمی کانفرنسوں اور اجلاسوں کو خطاب کیا اور اپنے خیالات پیش کیے۔ ان کے تعلیمی مضامین کا ایک مجموعہ 'مسلمانوں کی تعلیم' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں انھوں نے تعلیم کی اہمیت، افادیت، طرز تعلیم، مدارس کے نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت، خواتین کے لیے عصری تعلیم کی ضرورت اور علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"مجھے اس کے اعتراف میں تامل نہیں کہ میرے اکثر خیالات دراصل علامہ شبلی کے ان ہی افکار و خیالات کی صدائے بازگشت ہیں۔"

(مسلمانوں کی تعلیم، دیباچہ ص ۴، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء)

علامہ شبلی کی تصنیف 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیف 'مسلمانوں کی آئندہ تعلیم' کو پیش نظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی کتاب 'مسلمانوں کی تعلیم' دراصل شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات کی توسیع و تکمیل ہے۔

مولانا مرحوم نے علامہ شبلی کی کئی کتابوں پر مفصل مقالے لکھے ان میں الفاروق، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، سفرنامہ روم و مصر و شام، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی ﷺ کا مطالعہ و جائزہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے اور دکھایا ہے کہ ان پر جو اعتراضات کیے گئے وہ بیجا اور تعصب اور تنگ نظری کی مثالیں ہیں۔ اس سلسلے کا ان کا ایک معرکہ آرا مقالہ ہے جو انھوں نے سیرۃ النبی ﷺ پر ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے اعتراضات کے جواب میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم کی ایما پر 'تحدیث ملت' لکھنؤ میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہ الزامات بے سروپا ہیں۔

اسی طرح مقدمہ سیرۃ النبی ﷺ پر انھوں نے ایک مفصل مقالہ لکھ کر اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ شبلی کے

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲ - راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org